دستوری ترامیم یا مستقل مارشل لا

مشرف حکومت کی دستوری ترامیم کا تجزیہ

پروفیسر خورشید احمد

منشورات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنرل پرویز مشرف کی دستوری ترامیم کی بلّی دو سال سے قومی ادارہ تعمیرِ نو (این بی آر) کے تھیلے میں اُچھل کود مچائے ہوئے تھی۔ اس پورے عرصے میں اخبارات میں رونما ہونے والی جھلکیوں (leaks) اور اربابِ حکومت کے ارشادات کے ذریعے تانک جھانک کا ہنگامہ برپا رکھنے کے بعد اب ۲۶ جون ۲۰۰۲ء کو بالآخر تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ لیکن جو منظر سامنے آیا ہے وہ کم سے کم الفاظ میں یہ ہے کہ تھیلے سے نکلنے والی چیز نہ بلّی ہے اور نہ بلا' بلکہ ایک ایسی بلا ہے جسے اگر قابو نہ کیا گیا تو وہ جمہوری قبا میں ''دیو استبداد'' کا روپ دھار سکتی ہے۔ خطرہ اب آنکھوں کے سامنے ہے اور قوم کے لیے اس کا مقابلہ کرنے اور مقابلے کی تیاری کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

ہم نے ان ترامیم کو جنرل پرویز مشرف کی تجاویز کہا ہے اور محض جنرل تنویر نقوی یا دوسرے مشیروں کی اختراع قرار نہیں دیا' اگرچہ اظہار کا ذریعہ ان کو بنایا گیا ہے۔ جنرل صاحب نے خود بھی ان تجاویز کے دفاع کا اہتمام کیا ہے اور گذشتہ دو سال میں وہ وقتاً فوقتاً جن خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں' یہ اب ان کی ایک مربوط اور منظم شکل ہے۔ انھیں ان تجاویز کی ذمہ داری کھل کر قبول کرنی چاہیے اور قوم کو بھی سمجھنا چاہیے کہ جنرل صاحب کا ذہن اور منصوبہ کیا ہے؟ نیز ان کے اقتدار میں رہنے اور اقتدار کے رنگ و آہنگ کے عزائم

کے بارے میں کسی شک و شبہے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ این بی آر کے دانش ور اور جنرل صاحب کے وزرائے کرام جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ جنرل صاحب ہی کی صدائے بازگشت ہے۔ ان سب کا حال صرف یہ ہے کہ

انھی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں' زبان میری ہے بات ان کی

ان تجاویز کا ایک قابل قدر پہلو ان پر بحث و گفتگو کا عطا کیا گیا تھوڑا سا موقع ہے' جو لولا لنگڑا ہونے کے باوجود بسا غنیمت ہے۔ الیکٹرانک میڈیا پر حکومت اور اس کے ہم خیالوں کا اجارہ ہے' عوامی رائے کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے اور مخالف رائے کے اظہار کے لیے مساوی تو کیا مناسب مواقع بھی حاصل نہیں۔ لیکن سرکاری اہتمام میں ابلاغیاتی شعبدہ بازیوں کے باوجود جو بحث و مذاکرہ ہو رہا ہے' وہ تاریک افق پر روشنی کی ایک کرن ہے۔ اس ننھی سی کرن میں عوامی ردعمل اور سیاسی بصیرت رکھنے والوں کے اضطراب کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اب تک سامنے آنے والے ردعمل سے یہ بات مسلمہ ہے کہ تمام اہم سیاسی جماعتوں اور ہر مکتب خیال کے قائدین نے ان تجاویز سے کھل کر اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ ۹۰ فی صد اخباری تبصرے (اداریے' مضامین اور کالم) ان کے خلاف ہیں۔ جن حضرات نے جزوی تائید کی ہے ان کا رویہ بھی معذرت خواہانہ اور خفت بھرا ہے۔ نیز تمام ہی بار کونسلوں نے شدید تنقید کی ہے۔ اس قومی ردعمل کے جائزے سے جو تصویر سامنے آئی ہے' وہ ان تجاویز سے مکمل بے زاری اور عدم اتفاق کی ہے۔ چند مثبت یا قابل غور تجاویز کی نشان دہی کے ساتھ' تمام ہی حلقوں نے ترامیم کے اصل اہداف اور جوہری تبدیلیوں کو قطعاً ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ یہ قوم کے اصل جذبات اور احساسات کا آئینہ ہے۔ لیکن حکومت کا رویہ منفی اور بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ ضد اور ہٹ دھرمی کا مظہر ہے' جو ملک اور قوم کے مستقبل کے لیے اپنے اندر بڑے مہیب خطرات رکھتا ہے۔

اس پس منظر میں یہ ضروری ہے کہ بالکل غیر جذباتی انداز میں اصل مسائل پر دلیل کی زبان میں گفتگو کی جائے تاکہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے ساتھیوں کے باب میں

اتمام حجت ہو سکے اور پوری قوم اصل حقائق، مجوزہ ترامیم کے مضمرات اور متعلقہ دستوری، قانونی، سیاسی اور اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں کسی لاگ لپٹ کے بغیر آگاہ ہو جائے۔ اس سے آیندہ کے معرکے کامیابی سے سر کیے جانے کی امید کی جاسکتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان شاء اللہ دلیل کی قوت ذاتی عزائم، گروہی مفادات اور بودے سہاروں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گی--- جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

حکومت کی طرف سے ''مستحکم وفاقی جمہوریت'' (sustainable federal democracy) کے قیام کے لیے ۵۸ صفحے کی دستاویز شائع ہوئی ہے جو دستور کی ۲۸ دفعات میں ۷۳ ترامیم کی تجویز پر مشتمل ہے۔ اس کے لیے کچھ دلائل اور جواز (rationale) فراہم کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ ہم نے اس کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان تجاویز کے حق میں جنرل پرویز اور ان کے رفقاے کار نے جو کچھ کہا ہے اس پر کھلے دل سے غور کیا ہے۔ ان تجاویز پر جو نقد و تبصرہ گذشتہ تین ہفتوں کے دوران قومی و بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں شائع ہوا ہے، اس پر بھی کسی تعصب کے بغیر غور و فکر کیا ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں نظام حکومت کی تبدیلی کے بارے میں آج تک جو بھی تجاویز اور منصوبے آئے ہیں، ان میں یہ تجاویز سب سے زیادہ دور رس مگر منفی نتائج کی حامل ہیں۔ یہ تجاویز جنرل ایوب (۶۹-۱۹۵۸ء) اور جنرل محمد ضیاء الحق (۸۸-۱۹۷۷ء) کے دستوری تصرفات سے بھی زیادہ خطرناک، غیر متوازن اور غیر حقیقی ہیں، اور صرف شخصی حاکمیت کو مضبوط کرنے والی ہیں اور سیاست میں فوج کو اس طرح پھنسا دینے کا ذریعہ ہیں، جو ملک اور فوج دونوں کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ان کا گہری نظر سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ جزوی طور پر ان میں سے چند تجاویز اور مسائل کے تجزیے کے سلسلے میں چند امور ایسے بھی ہیں جن پر صحیح فورم میں غور ہو سکتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ ترامیم، دستور کا حلیہ بگاڑنے، اور ملک کے سیاسی نظام کو ایک ایسا ملغوبہ بنانے پر منتج

ہوں گی جو نہ جمہوری ہوگا' نہ وفاقی (فیڈرل) اور نہ کسی دیرپا نظام کا ضامن ہو سکے گا۔ عنوان میں جو تین اہداف رکھے گئے ہیں: دیرپا' وفاقی اور جمہوری' یہ تجاویز ان تینوں کی نفی کرتی ہیں اور 'برعکس نہند نام زنگی کافور' کے مثل ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایک ایک تجویز پر مفصل گفتگو کی جائے' تاہم یہاں ان کے صرف چھے مرکزی پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی۔ پھر ہم حکومت اور قوم کو دعوت غور وفکر دیں گے اور بتائیں گے کہ قوم اور ملک کے مفاد میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔

ترمیم کا اختیار

سب سے پہلا اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا جنرل پرویز مشرف کو دستور میں اس طرح ترمیم کرنے کا کوئی اختیار حاصل ہے؟

جو بھی اقدام کسی قانونی اور اخلاقی استحقاق (legal and moral authority) کے بغیر کیا جائے گا' وہ کبھی مقبول اور معتبر نہیں ہوگا۔ قانونی جواز ہی عوامی قبولیت اور دیرپا استحکام کی بنیاد بنتا ہے اور جو نظام قانونی اور اخلاقی جواز سے محروم ہو وہ مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوتا ہے۔

جنرل مشرف اور بی این آر نے جنرل صاحب کے اختیارات برائے ترمیم دستور کی بنیاد' سپریم کورٹ کے ۱۲ مئی ۲۰۰۰ء کے فیصلے پر رکھی ہے' اس لیے سب سے پہلے اس مسئلے پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔

دستور ایک ملک کے بنیادی قانون (fundamental law) کا درجہ رکھتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ قومی اتفاق رائے کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ بلاشبہہ وہ ایک انسانی دستاویز ہے اور اس میں تبدیلی ممکن ہے لیکن اس کے لیے وہی طریقہ قابل قبول ہو سکتا ہے جو خود دستور میں طے کیا گیا ہے۔ اس سے ہٹ کر کوئی طریقہ معتبر نہیں ہو سکتا۔

یہ بات یاد دہانی کے لیے ضروری ہے کہ اس دستور میں خود وزیراعظم ذوالفقار علی

بھٹو کے دور (۷۷-۱۹۷۳ء) میں سات ترامیم کی گئیں، جن میں سے صرف ایک ترمیم (یعنی قادیانیت کے بارے میں) پر اتفاق رائے تھا اور صرف وہی ترمیم معتبر رہی۔ باقی ترامیم بھٹو صاحب کے دور کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔ جنرل محمد ضیاالحق کی ترامیم کا معاملہ بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں۔ ان پر قومی اتفاق رائے نہیں تھا لیکن انھوں نے ۱۹۸۵ء کی منتخب پارلیمنٹ سے اپنی ایک درجن ترامیم کو متفقہ طور پر منظور کرانے کے لیے ایک نام نہاد اتفاق رائے (pseudo consensus) پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

۱۹۷۳ء کے دستور کی تین بنیادیں ہیں: اسلام، وفاقی نظام اور پارلیمانی جمہوریت جو پارلیمنٹ کی بالادستی، عدلیہ کی آزادی، بنیادی حقوق کی ضمانت اور انتظامیہ کی پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہی سے عبارت ہے۔ دستور نے ترمیم کا بھی ایک واضح طریق کار طے کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دستور میں ترمیم نہ صدر کر سکتا ہے اور نہ سپریم کورٹ۔ اسی طرح چیف آف آرمی اسٹاف (COAS) جس دستور کی تخلیق ہے، اس میں وہ بھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ دستور میں ترمیم تو اتنا نازک معاملہ ہے کہ محض ایک ایوان پارلیمنٹ (یعنی سینیٹ یا قومی اسمبلی) بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ دستور نے ترمیم کا جو طریقہ رکھا ہے وہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت کی رضامندی سے ترمیم ہو سکتی ہے۔ گویا، اگر ایک ایوان بھی اتفاق نہ کرے تو ترمیم ممکن نہیں۔ اس کے لیے مشترک اجلاس کی گنجایش نہیں رکھی گئی ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ سپریم کورٹ کے مئی ۲۰۰۰ء کے فیصلے کی حقیقت کیا ہے اور اس کا جائز اور قانونی منشا کیا ہو سکتا ہے۔

اصل فیصلے پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ چند دوسرے حقائق بھی سامنے رہیں۔ نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ نے جنرل ضیاء الحق کو ترمیم دستور کا اختیار دے دیا تھا، مگر جنرل صاحب نے جب عبوری دستور کا حکم نامہ (پی سی او) نافذ کیا تو اس وقت کے چیف جسٹس انوار الحق صاحب نے جو اصل فیصلے کے مصنف تھے، اسے نصرت بھٹو کیس میں دیے ہوئے اختیار سے تجاوز اور عدالت کے فیصلے سے انحراف قرار دیا اور اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ اس سے سبق لیتے ہوئے سپریم کورٹ نے مئی ۲۰۰۰ء کے فیصلے میں ''محدود

اور مشروط اختیار'' کا راستہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں آج کی صورت حال اس سے یکسر مختلف ہے جس کا سہارا ماضی میں لیا گیا۔

دوسری بات یہ بھی سامنے رہے کہ دستور میں ترمیم کے مسئلے پر بھارت اور پاکستان کی سپریم کورٹ نے دو بڑے اہم فیصلے دیے ہیں۔ بھارت میں اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کی تو سپریم کورٹ نے طے کیا کہ پارلیمنٹ بھی دستور میں من مانی ترمیم نہیں کرسکتی۔ تدوین دستور اور ترمیم دستور دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ تدوین دستور صرف دستور ساز اسمبلی ہی کرسکتی ہے جسے عوام نے دستور سازی کا اختیار دیا ہو۔ دستور کے تحت قائم ہونے والی پارلیمنٹ دستور کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی نہیں کرسکتی۔ البتہ اس ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے اسے ترمیم کا اختیار ہے اور یہی ترمیم کا مفہوم ہے۔ گویا لفظ ''ترمیم'' کی محکم تعبیر کر دی گئی۔ دستوری تاریخ میں یہ بڑا بنیادی فیصلہ تھا۔ اسی طرح کا ایک فیصلہ پاکستان کی سپریم کورٹ نے اچک زئی کیس میں کیا اور یہ اصول طے کر دیا کہ دستور کے بنیادی ڈھانچے میں ترمیم کا اختیار خود اسمبلی کو بھی نہیں۔ چہ جائیکہ کوئی فرد واحد یہ اختیار رکھنے کا دعویٰ کرے۔ سپریم کورٹ خود بھی دستور میں ترمیم نہیں کرسکتی۔ وہ صرف دستور میں ترمیم یا قانون کا عدالتی جائزہ (judicial review) لے سکتی ہے۔ اس کا دائرہ تعبیر دستور ہے، ترمیم دستور نہیں۔ اس تناظر میں سپریم کورٹ بھی یہ اختیار نہیں رکھتی کہ کسی کو دستور میں کسی بنیادی تبدیلی کا حق دے سکے۔

اس پس منظر میں سمجھا جاسکتا ہے کہ ۱۲ مئی کے فیصلے میں سپریم کورٹ نے کیا کہا:

ہرگاہ کہ جنرل پرویز مشرف نے ایک ماورائے دستور اقدام کے ذریعے ریاست کے مفاد میں اور عوام کی بھلائی کے لیے جائز طور پر اقتدار سنبھال لیا ہے، انھیں حق ہے کہ ایسے سب اقدامات کریں اور ایسے قانونی راستے اختیار کریں، جن کا آگے بیان کیا جارہا ہے، یعنی:

۱- ایسے سب اقدامات یا قانونی راستے جو ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق ہیں یا اس کے تحت کیے جاسکتے تھے بشمول اس میں ترمیم کے اختیار کے۔

۲- ایسے تمام اقدامات جو چیف ایگزیکٹو کے اعلان کردہ مقاصد کو حاصل کریں یا ان کے حصول میں مدد دیں۔

اس کے ساتھ عدالت نے واضح کر دیا کہ:

یہ کہ چیف ایگزیکٹو کی جانب سے دستوری ترامیم صرف اس صورت میں کی جاسکتی ہیں کہ دستور ان کے اعلان کردہ مقاصد کے حصول کے لیے کوئی حل فراہم کرنے سے قاصر ہو۔

یہ کہ دستور کی بنیادی خصوصیات میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی، یعنی عدلیہ کی آزادی، وفاقیت، پارلیمانی طرز حکومت بشمول اسلامی دفعات۔

اس فیصلے کی جو تعبیر دستور اور دستور کے متعلق عدالتی فیصلوں کی روشنی میں کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے چیف ایگزیکٹو کو اپنے اعلان کردہ پروگرام پر عمل کرنے کے لیے ۳ سال کی مدت دی اور ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۲ء سے پہلے نئے انتخابات منعقد کرنے کو ضروری قرار دیا۔

واضح رہے کہ چیف ایگزیکٹو کے جس ۷ نکاتی ایجنڈے پر عمل کے لیے ۳ سال کی مدت اور قانون سازی کا اختیار عدالت نے دیا وہ ان نکات پر مشتمل تھا:

۱- قومی اعتماد کی بحالی، ۲- بین الصوبائی تفاوت دُور کر کے قومی یک جہتی کی بحالی، ۳- معیشت کا احیا، ۴- امن عامہ کو یقینی بنانا اور فوری انصاف کی فراہمی، ۵- سرکاری اداروں سے سیاست کو خارج کرنا، ۶- اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی، ۷- احتساب۔

اگر عدالت کے فیصلے اور جنرل صاحب کے ایجنڈے کا معروضی تجزیہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ عدالت نے قانون سازی بشمول دستوری ترمیم کا اختیار ان ۳ سال کے اندر اس سات نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کے لیے دیا تھا، مستقبل کے لیے کسی نئے دستوری ڈھانچے کی تعمیر کے لیے نہیں۔ ان ساتوں نکات کا کیا حشر ہوا؟ اسے اس وقت نظرانداز کر دیجیے (ان کے بارے

میں دیکھیے: اشارات' ترجمان القرآن' جون ۲۰۰۲ء) اور صرف اس مسئلے پر غور کیجیے کہ ان میں سے کس کا تعلق صدر کے اختیارات' وزیراعظم کی تقرری اور معزولی' اسمبلی کی تحلیل' گورنروں کے تقرر اور قومی سلامتی کونسل کی تشکیل سے ہے۔ یہ مسائل سرے سے عدالت کے زیرغور نہیں تھے۔ زیرغور صرف وہی سات نکات تھے' جن پر جنرل پرویز مشرف اقتدار سنبھالنے (۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء) کے بعد کچھ کر کے دکھانا چاہتے تھے۔ سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ اس ایجنڈے پر کام کرنے کے لیے ان کو جن اقدامات یا قانون سازی کی ضرورت ہے وہ اسے انجام دے سکتے ہیں۔ عدالت نے لازم کیا کہ اس عمل میں ان کو ہر قدم دستور کے دائرے میں اٹھانا چاہیے اور دستور میں جو طریق کار دیا گیا ہے' اس کا مکمل احترام کرنا چاہیے۔ البتہ اگر کہیں مشکلات درپیش ہوں تو انھیں رفع کرنے (removal of difficulty) کے لیے' جو ایک معروف قانونی تصور (legal concept) ہے' کوئی ترمیم دستور میں کرنی پڑے تو کی جاسکتی ہے۔ اس کا دورانیہ بھی یہ تین سال تھے۔ اس دورانیے کے بعد کا نظام کورٹ کے فیصلے کے دائرے سے قطعاً باہر ہے۔

اپنے اس تین سالہ دور میں انھوں نے صحیح یا غلط کئی دستوری اقدام کیے جن میں صدارت کا مسئلہ بھی تھا (جو خود انھوں نے غیرفطری اور غیرضروری طور پر پیدا کیا)۔ سپریم کورٹ کے ترمیم دستور کے اختیار کا تعلق اگر ہوسکتا ہے تو صرف ان مسائل اور اس دور سے ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں ہرگز یہ اختیار نہیں کہ وہ آیندہ کا نیا سیاسی نظام ملک کو دیں- یہ نہ ان کے اصل ایجنڈے کا حصہ ہے' نہ سپریم کورٹ کے فیصلے میں اس دائرہ کار کا کوئی ذکر ہے' اور نہ کسی بھی دلیل کے ذریعے اسے ان کی ذمہ داری قرار دیا جا سکتا ہے- جو ترامیم وہ اب لائے ہیں ان کا کوئی تعلق اس ایجنڈے سے نہیں۔ بلکہ واضح طور پر وہ ان تمام آئینی حدود اور اخلاقی پابندیوں کو پامال کرنے کا باعث ہوں گی جو سپریم کورٹ نے صاف لفظوں میں عائد کی

تھیں--- یعنی پارلیمانی نظام اور وفاقیت کے اصول کی حفاظت- دستوری ترامیم کی جو تجاویز اس وقت پیش کی جارہی ہیں' ان کے لیے سپریم کورٹ کی محدود اور مقید اجازت کا سہارا ایک ایسی جسارت ہے جسے شیطان کے آیتیں پڑھنے (devil quoting scriptures) کی بدترین مثال ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

دستور میں ترمیم' دستور کے دیے ہوئے طریقے کے مطابق ہی ہوسکتی ہے۔ جنرل صاحب کے لیے ایک ہی معقول راستہ ہے اور وہ یہ کہ الیکشن کے بعد دستوری ترمیم کے مسئلے کو پارلیمنٹ میں زیر بحث لانے کی دعوت دیں اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوان ان پر کھلی بحث کے ذریعے میرٹ کی بنیاد پر غور کریں۔ کسی فرد واحد کو یہ اختیار نہیں کہ دستور کی من مانے انداز میں بیخ کنی کرے یا قوم کے متفقہ دستور پر اپنے زعم میں جو نیا ڈھانچا چاہے مسلط کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دے۔ افسوس کہ جنرل پرویز نے اپنے پیش رو فوجی حکمرانوں اور طالع آزماؤں کی اسی نوعیت کی کوششوں اور ان کے انجام سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔

جنرل ایوب مرحوم نے ایک فرد واحد کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء کا دستور بنایا اور وہ دستور ان کے اقتدار کے سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی ماضی کا قصہ بن گیا' بلکہ خود ان کے اپنے ہاتھوں اس وقت اس کا جھٹکا ہو گیا جب انھوں نے اس دستور کے تحت اقتدار اسمبلی کے اسپیکر کی طرف منتقل کرنے کے بجائے فوج کے سربراہ جنرل یحییٰ خان کو منتقل کیا۔ جنرل یحییٰ نے جو دستور بنایا' وہ ان کے رخصت ہونے کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق کو اسمبلی اور سینیٹ سے سمجھوتہ کر کے اپنی ترمیمات منوانا پڑیں اور پھر بھی ان کو وہ تقدس اور احترام حاصل نہ ہوسکا جو دستور کا حق ہے۔ اب جنرل پرویز صاحب بھی ناکامیوں کے اسی راستے پر چلنے کی جسارت کر رہے ہیں' لیکن اس کا انجام بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہوسکتا۔

اخلاقی حیثیت

دوسرا بنیادی مسئلہ جنرل صاحب کی ذات اور اخلاقی استحقاق کا ہے۔ انھیں اپنی

بنیادی حیثیت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ وہ لاکھ لوگوں کو یقین دلائیں کہ وہ ''اب بھی ۱۹۹۹ء والے جنرل مشرف ہی ہیں''، لیکن ان تین برسوں میں ان کی شخصیت بری طرح مجروح ہوئی ہے۔ اب قوم انھیں ان کے تین سالہ ریکارڈ کی روشنی میں دیکھ رہی ہے۔ ان کے سات نکات میں سے ایک بھی مثبت نتائج سامنے نہ لا سکا۔ قومی وقار بلکہ ملک کی آزادی، خودمختاری اور اس کے اقتدار اعلیٰ کی جو پامالی اس دور میں ہوئی ہے وہ شرم ناک ہے۔ انھوں نے امریکہ کے عالمی استعماری عزائم کا آلہ کار بننے میں کسی خودداری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جس طرح امریکہ نے پرویز صاحب کے ہاتھوں پاکستان کو استعمال کیا ہے اور بھارت کے ساتھ اسٹرے ٹیجک شراکت کا تانا بانا بُنا ہے اس نے ملک کو نئے اندرونی اور بیرونی خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ جو دوست تھے وہ دشمن بن گئے ہیں، جو مخالف تھے وہ سر چڑھ رہے ہیں اور جو نفرت امریکہ کا مقدر تھی اس کا ایک حصہ اب ہمارے حصے میں بھی آ گیا ہے۔ بلکہ اگر امریکی روزنامہ وال اسٹریٹ جرنل کے ایک تازہ جائزے پر یقین کیا جائے تو خود جنرل صاحب کی امریکہ کے لیے افادیت کی مدت اکتوبر ۲۰۰۲ء تک رہ گئی ہے۔ کینیڈا کے روزنامہ دی گلوب اینڈ میل میں پال ناکس نے کئی ماہ پہلے ہی پیشین گوئی کر دی تھی:

> اب جب کہ (افغانستان پر امریکہ کا مسلط کردہ) جنگ کے آخری مراحل ہیں، جنرل مشرف سیاسی شطرنج کے اس کھیل کے اختتام پر نقصان میں ہیں۔ (اس نے مبصرین کی یہ رائے بھی نقل کی تھی کہ:) ہم بین الاقوامی سطح پر بنیادی طور پر تعلقات کی نئی ترتیب تشکیل پانے کی تصویر دیکھ رہے ہیں۔ امریکہ، بھارت، اسرائیل اور روس کئی مسائل پر بظاہر قریب آتے نظر آ رہے ہیں، لیکن پاکستان کو بے آسرا چھوڑ دیا گیا ہے۔ (۱۰ دسمبر ۲۰۰۱ء)

امریکی جریدے نیوز ویک (۱۵ جولائی ۲۰۰۲ء) نے پاکستان کے حالات کی جو منظر کشی کی ہے وہ جنرل صاحب کی تین سالہ کارکردگی کی عکاس ہے:

> بہت سے پاکستانی، فوج میں اس لیے شامل ہوئے کہ اپنے ملک کا بھارت کے

خلاف دفاع کریں گے۔ وہ اس کے لیے لڑنے اور جان دینے کے لیے تیار اور راضی ہیں۔ لیکن اب ان میں سے بہت سوں کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ وہ غلط دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ (ص ۱۸)

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون نے اپنی ۶ جولائی کی اشاعت میں نیویارک ٹائمز کا اداریہ شائع کیا ہے، جس میں ایک طرف اس بات کا اعتراف ہے کہ جنرل مشرف اب بھی نام نہاد ''تشدد کے خلاف جنگ'' میں امریکہ کی ضرورت ہیں۔ وہ اس لیے بھی امریکہ کے لیے مفید ہیں کہ وہ ''مغرب نواز اور سیکولر نظام حکمرانی کے علم بردار'' ہیں۔ لیکن ساتھ ہی کشمیر کے سلسلے میں ان کے کردار کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس زمینی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ریفرنڈم کی حماقت کر کے انھوں نے اپنی پوزیشن کمزور کر لی ہے اور جمہوری اداروں کو فوجی نکیل ڈالنے کے لیے جو دستوری ترامیم وہ لا رہے ہیں اس سے ان کی عوامی مقبولیت کو دھچکا لگے گا اور ملک میں ان سے مایوسی پیدا ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک اور ملک سے باہر جنرل پرویز مشرف کی پوزیشن روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ آج ان کی کوئی عزت نہیں ہے، اور پاکستان کے ساتھ بھی وقار اور عزت کا معاملہ نہیں کیا جا رہا جس کی تازہ ترین مثال وہ ہے جس میں امریکہ کے نائب وزیر خارجہ آرم ٹیج نے سرحد پار ''دراندازی'' روکنے کے وعدے مکمل طور پر پورے نہ کرنے پر جنرل صاحب اور ان کے نمایندوں کو جھاڑ پلائی ہے۔ آج بھارت کو تو اس کے ریاستی تشدد پر کوئی کچھ نہیں کہہ رہا، اور سارا دباؤ صرف پاکستان پر ہے کہ وہ جہاد کشمیر کی ہر قسم کی اعانت سے دست کش ہو جائے۔ اس صورت حال کا موازنہ اگر ۱۰ سال پہلے کے حالات سے بھی کیا جائے تو فرق واضح ہو جاتا ہے۔

بھارت کے ایک سابق کیبنٹ سیکرٹری وی بالا چندرن نے ۱۰ جولائی ۲۰۰۲ء کے دی ایشین ایج میں اپنی جو یادداشتیں شائع کی ہیں وہ پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں۔ وہ ۱۴ دسمبر ۱۹۹۲ء کو واشنگٹن میں اس وقت کے سی آئی اے کے ڈائرکٹر روبرٹ گیٹس سے ان کے دفتر میں ملاقات میں پاکستان کے خلاف اسی سرحد پار دراندازی کے بارے

میں اپنی شکایت کا ذکر کرتے ہیں اور روبرٹ گیٹس کے ردعمل کو بیان کرتے ہیں:

ہمیں امید تھی کہ وہ پاکستان کی پشت پناہی سے ہونے والی دہشت گردی پر تشویش کا اظہار کریں گے اس لیے کہ وہ برعظیم میں ہونے والے واقعات سے قریب سے واقف رہے تھے۔ مگر ہم تعجب کرتے رہ گئے جب انھوں نے ہمارے لیڈروں کو ایک ناصحانہ ڈانٹ پلائی: ''مسٹر سیکرٹری، ہم نے آپ کی باتوں کو نوٹ کر لیا ہے، لیکن دوسری طرف ہم پاکستان سے آپ کے خلاف ایسی ہی شکایتیں سن رہے ہیں اور ہم پسند کریں گے کہ ایسی شکایتیں آیندہ نہ سنیں''۔ (دی ایشین ایج، لندن، ۱۰ جولائی ۲۰۰۲ء)

یہ تھا امریکہ کا رویہ ۱۰ سال پہلے، اور آج جنرل صاحب کی امریکہ کی ساری ناز برداری کے باوجود، کیا ہے ہماری عزت اور وقعت! ہوسکتا ہے کہ امریکہ کی نظر میں جنرل پرویز ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۲ء میں ایک ہی جیسے ہوں، لیکن پاکستان کا حال تو ایک سا نہیں رہا۔

کسی بھی فرد واحد کو دستور میں ترمیم کا اختیار نہیں۔ قائداعظم کی تقلید کی باتیں تو ہم بہت کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ قائداعظم جن کی قیادت میں ملت اسلامیہ ہند نے پاکستان قائم کیا اور ان کو بے تاج ہی نہیں تاجدار ''بادشاہ'' کا مقام دیا، انھوں نے بھی ایک بار نہیں بلکہ بار بار فرمایا: ''کہ پاکستان کا دستور بنانے کا کسی فرد کو اختیار نہیں۔ یہ صرف دستور ساز اسمبلی کا استحقاق ہے اور وہی یہ کام انجام دے سکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو ان کی تقریر سبی دربار بلوچستان، ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء۔ خطاب سول افسران سبی، ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء۔ خطاب عوام ریاست ہاے متحدہ امریکہ، فروری ۱۹۴۸ء (Jinnah: Speeches and Statements, 1947-48 آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ص ۱۰۸-۱۱۲-۱۲۵)

سوال یہ ہے کہ جو اختیار قائداعظم نے اپنے لیے بھی صحیح نہ سمجھا، بھلا جنرل پرویز صاحب کس دستوری، قانونی، سیاسی اور اخلاقی بنیاد پر یہ اختیار مانگ رہے ہیں اور صرف اختیار ہی نہیں مانگ رہے بلکہ دستور کی جامہ تراشی (ٹیلرنگ) کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صرف

انھی کے قد و قامت کی تزئین کا سامان بن جائے۔

آئینی ترامیم کے بارے میں ہمارا پہلا اعتراض دستوری اور اصولی ہے۔ لیکن اب اس بارے میں بھی کوئی اشتباہ باقی نہیں کہ جنرل پرویز صاحب جس راستے پر چل نکلے ہیں، وہ ذاتی اقتدار کے استحکام اور فوج کے شانوں پر سوار ہو کر شخصی حاکمیت کا قیام کے سوا کچھ نہیں۔

پہلے وہ یہ دعوے کرتے تھے کہ ''میرا کوئی شخصی ایجنڈا نہیں'' لیکن ان ترامیم نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کا ہدف اداروں کا استحکام نہیں، بلکہ ایک فرد کے ہاتھوں میں اقتدار اور سیاسی قوت کو محصور کرنا اور اسے اصل اختیارات کا مرکز بنانا ہے خواہ اس سے دستور کی صورت کتنی ہی بدنما کیوں نہ ہو جائے اور ملک کیسے ہی خطرات سے دوچار ہو جائے۔ اس کے لیے عدالت اور فوج دونوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ انتظامیہ اور نئی سول حکومت کا جو نظام بنایا گیا ہے اسے بھی اس مقصد کے حصول کے لیے جھونک دیا گیا ہے۔

اس سلسلے کا آغاز، صدارت پر شب خون مارنے سے ہوا۔ پھر ریفرنڈم کا ڈراما رچایا گیا اور اب آئینی ترامیم کے ذریعے ایک ایسا سیاسی نظام ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جس سے ملک میں نہ معروف معنوں میں پارلیمانی نظام باقی رہے گا اور نہ معروف تصور کے مطابق کوئی صدارتی نظام ہی وجود میں آسکے گا۔ بلکہ ایک ایسا مخلوط نظام (hybrid system) ہمارا مقدر ہوگا، جس کو غالباً عسکری صدارت (militopresidentism) کہا جائے تو نادرست نہ ہوگا۔ ان ترامیم کا لازمی تقاضا ہے کہ قوت کا سرچشمہ صدر کی ذات بن جائے اور اصرار ہے کہ وہ صدر چیف آف اسٹاف بھی ہوگا۔ اس صدر کو صرف اسمبلی توڑنے ہی کا مکمل اختیار حاصل نہیں ہوگا بلکہ وزیراعظم نامزد کرنے، وزیراعظم یا اس کی کابینہ کو برطرف کرنے اور وزیراعظم کی طرف سے اسمبلی کی تحلیل کے مشورے کو اسمبلی کو واپس بھیجنے کا اختیار بھی ہوگا۔ اسی طرح اسے تمام صوبوں کے گورنر مقرر کرنے کا اختیار ہوگا اور یہ گورنر، صدر کی طرح وزیراعلیٰ نامزد کرنے اور ہٹانے اور صوبائی اسمبلی تحلیل کرنے کا اختیار رکھیں گے، جسے وہ صدر کے مشورے سے انجام دیں گے۔ اس

صدر کو تمام اہم تقرریاں کرنے کا بھی کلی اختیار ہوگا یعنی چیف الیکشن کمیشن، چیئرمین پبلک سروس کمیشن، بری، بحری اور ہوائی افواج کے سربراہ، جوائنٹ چیف آف اسٹاف کا سربراہ، نیب کا سربراہ وغیرہ وغیرہ۔ صدر، قومی سلامتی کونسل کا سربراہ بھی ہوگا اور اس میں فوج کے تمام سربراہ موجود ہوں گے۔

سیاسی جماعتوں کے لیے تو پابندی ہے کہ ان کے سربراہ اور نمایندے جماعت اور حکومت دونوں کے بیک وقت عہدہ دار نہیں ہو سکتے، لیکن فوج کے سربراہ کے لیے کوئی پابندی نہیں کہ صدر ہوتے ہوئے وہ فوج کا سربراہ نہیں ہو سکتا۔ دستور کی خلاف ورزی پر وزیراعظم کو تو برطرف کیا جاسکتا ہے، مگر دستور کی خلاف ورزی صدر اور چیف آف اسٹاف کے لیے معاف ہے۔ دستور کی یہ شق کہ کوئی حاضر سروس سرکاری ملازم اسمبلی کا رکن نہیں بن سکتا، چیف آف اسٹاف کے لیے ساقط ہو جائے گی۔ توازن اور تحدید (چیک اینڈ بیلنس) کی بات تو کی جاتی ہے، لیکن یہ کیسا توازن ہے، کہ جس میں صدر، چیف آف اسٹاف ہو اور تمام صواب دیدی اختیارات سے بھی مسلح ہو۔ وہ ایک پلڑے میں ہے اور دوسرے میں منتخب پارلیمنٹ جو صدر ہی کے رحم و کرم پر ہے۔ اگر توازن اسی کا نام ہے تو پھر الفاظ و معنیٰ میں ربط کی بات کرنا پاگل پن ہی ہو سکتا ہے۔

وزیراعظم کے لیے تو بجا طور پر یہ شرط ہے کہ اگر اس کے خلاف مواخذے کی قرارداد آجائے تو وہ اسمبلی کو تحلیل کرنے کی سفارش نہیں کر سکتا، لیکن صدر کے خلاف اگر مواخذے کی قرارداد آجائے تو وہ اس کے بعد بھی اسمبلی کو تحلیل کر سکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی چیک نہیں ہے۔ یہ کیسا چیک اینڈ بیلنس ہے؟ کسی ایک فرد کو سیاسی نظام کا اس طرح محور بنا دینا دراصل ایک قسم کی بادشاہت قائم کرنے کی کوشش ہے، جو تاریخ کے دھارے کو الٹے رُخ موڑنے کے مترادف ہے۔ امریکہ کی نارتھ ڈام یونی ورسٹی کے پروفیسر رابرٹ جوہانسن نے اپنے ایک مقالے Military Policies and the State System as Impediments to Democracy" میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے، جسے جنرل صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے:

کسی فرد کو خواہ وہ کتنا ہی عقل مند، کتنا ہی نیک اور کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو، کبھی بھی اس کے ہاتھ میں ایسے فیصلے کرنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا جو انسانی تاریخ میں بے حد اہم اور ناقابل تلافی ہوں۔ اس طرح کے اختیارات کسی جمہوریت میں جائز نہیں سمجھے جا سکتے۔ (بحوالہ Prospects for Democracy، تدوین: ڈیوڈ ہیلڈ، اسٹینفورڈ یونی ورسٹی پریس، کیلی فورنیا، ۱۹۹۳ء، ص ۲۲۶)

ملک میں استحکام اداروں کی مضبوطی سے آتا ہے، محض افراد کو مرکز اقتدار بنانے سے نہیں۔ جو قانون اور ضابطہ اصول اور حق پر مبنی نہ ہو اور جسے محض افراد کی خواہشات کی مناسبت سے وضع کیا گیا ہو، وہ ترقی کی راہ کی رکاوٹ تو بن سکتا ہے، اس کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ جنرل صاحب نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ملک و قوم کے مفاد سے تو یقیناً متصادم ہے، خود ان کے لیے بھی خیر کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ فی الحقیقت اس ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ہوش کے ناخن لیں، تاریخ سے سبق سیکھیں اور اداروں کی تباہی سے باز رہیں۔ جس سمت میں وہ چل پڑے ہیں وہ جمہوریت کی سمت نہیں، بلکہ شخصی حکومت اور مطلق العنانیت کا راستہ ہے اور اسے یہ قوم ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق، بے نظیر اور نواز شریف جس نے بھی اپنے اپنے انداز میں شخصی حکومت اور آمریت (خواہ سول ہو یا خاکی، منتخب ہو یا غیر منتخب) کا راستہ اختیار کیا، اس نے ملک و قوم کو نقصان پہنچایا اور وہ خود بھی ناکام و نامراد رہا۔ عقل مند وہ ہے جو تاریخ کے دوسرے کرداروں سے عبرت پکڑے اور وہ غلطیاں نہ دہرائے جو دوسروں نے کیں اور جو قوم کے لیے خرابی اور خود ان کے لیے نامرادی کا باعث بنیں۔

فوج کا کردار

مجوزہ آئینی ترامیم کا تیسرا بڑا اہم پہلو سیاست میں فوج کو مستقل طور پر ملوث کر دینا ہے۔ اس طرح اس کا ایک مستقل کردار وضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جنرل تنویر نقوی نے بہت صاف لفظوں میں اس امر کا اظہار کر دیا ہے کہ "ملکی

سیاست میں فوج کا غیر تحریری، غیر واضح اور غیر رسمی کردار تو ہمیشہ رہا ہے، اب اسے باضابطہ کر دیا گیا ہے"۔ ہمارے خیال میں، یہ مستقبل کے لیے مارشل لا کا راستہ روکنے کی تدبیر نہیں ملک کو مستقلاً مارشل کے زیر سایہ رکھنے کا منصوبہ ہے - اس کی شکل یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف کی ذات میں صدارت اور چیف آف آرمی اسٹاف کی دونوں حیثیتیں جمع کر دی گئی ہیں اور ان کو کم از کم پانچ سال تک جمع رکھا جائے گا۔ جنرل پرویز مشرف نے بی بی سی کو ایک انٹرویو میں صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ "میں یہ دونوں عہدے ساتھ ساتھ رکھوں گا"۔ اس کے ساتھ ایک مستقل غیر منتخب ادارہ، قومی سلامتی کونسل کی شکل میں بنایا جا رہا ہے جس کا سربراہ صدر ہوگا۔ اس کے ارکان میں تینوں افواج کے سربراہ اور جوائنٹ چیف آف اسٹاف کے سربراہ شامل ہوں گے۔ ان کے علاوہ وزیراعظم اور چاروں وزرائے اعلیٰ اس میں ہوں گے اور اب تجویز ہے کہ قائد حزب اختلاف بھی اس میں ہوگا۔ اس کونسل کے سلسلے میں امریکہ کی قومی سلامتی کونسل کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور ماقبل کی کوششوں سے موازنہ کر کے اس کی ضرورت اور افادیت بیان کی گئی ہے۔

ہماری نگاہ میں یہ ایک نہایت خطرناک تجویز ہے، جسے چند در چند مغالطوں کے ذریعے قابل قبول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ان تضادات کو بھی نظرانداز کیا جا رہا ہے جو خود اس تجویز میں مضمر ہیں۔

جس وجہ سے یہ تجویز کسی بھی شکل میں ہماری نگاہ میں قابل قبول نہیں، وہ یہ تصور ہے کہ "طاقت کے تین مرکز ہیں: صدر، وزیراعظم اور فوج اور ان کے درمیان اشتراک اقتدار ہونا چاہیے"۔ پھر اشتراک اقتدار کے لیے بھی یہ محکم "اصول" بطور بنیاد بیان کیا گیا ہے کہ "وحدت اقتدار (unity of command) ضروری ہے، اس کے بغیر جوتیوں میں دال بٹے گی"۔ پھر اس وحدت کی ٹوپی صدر کے سر پر رکھی گئی ہے اس لیے کہ وہ چیف آف اسٹاف بھی ہے۔ کل ایسا صدر بھی ہو سکتا ہے جو چیف آف اسٹاف نہ ہو تو پھر اس وحدت اقتدار کا کیا بنے گا؟ کیا پھر وہ کش مکش شروع نہ ہو جائے گی؟ یا ہمیشہ کے لیے ضروری ہوگا

کہ چیف آف اسٹاف ہی صدر بنے؟ اور کیا آئندہ کے چیف آف اسٹاف اس پر قانع ہو جائیں گے کہ وہ صرف چیف آف اسٹاف رہیں اور صدر کوئی دوسرا ہو۔

قانون کے مطابق چیف آف اسٹاف کے لیے ایک متعین مدت ہے اور فوج کی تینوں شاخوں کے سربراہوں کے لیے ایک ہی مدت ہے۔ لیکن بری فوج کے چیف آف اسٹاف کا معاملہ مختلف کر دیا گیا ہے، جو فضائیہ اور بحریہ میں بددلی پیدا کرنے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ صدر کے لیے بطور چیف آف اسٹاف خود اپنی مدت ملازمت میں توسیع کا راستہ کھلا ہوا ہے، جب کہ باقی سب کے لیے مدت کی تحدید ہے، بشمول وزیراعظم اور وزیراعلیٰ۔ ان تمام تضادات کی کوئی توجیہ نہیں کی گئی۔ قومی سلامتی کونسل کے جواز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ مشاورتی ادارہ ہے لیکن مشاورتی ادارہ صدر کے لیے ہے جو کم از کم دستوری طور پر اور خود جنرل پرویز کے اعلانات کے مطابق قوت نافذہ رکھنے والا صدر (executive president) نہیں ہے۔ حالانکہ مشورہ دینے والا ادارہ یا ایگزیکٹو سربراہ کے لیے ہوتا ہے یا ادارہ خود ایگزیکٹو ہوتا ہے۔ لیکن جس نوعیت کی کونسل یہاں بنائی جا رہی ہے اس کے وظائف اور اس کے جواز کے دلائل میں کوئی نسبت نہیں۔

سب سے بنیادی اور مرکزی سوال ملک کے سیاسی نظام میں فوج کے کردار کا ہے۔ جو لوگ زمینی حقائق کی بات کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی ایک زمینی حقیقت ہے کہ فوجی حکمرانی کے چاروں ادوار میں فوج کی سیاسی میدان میں کارکردگی بھی اتنی ہی ناکام رہی ہے جتنی نام نہاد جمہوری سول حکومتوں کی۔ بلکہ ملک کی سلامتی اور وحدت کو زیادہ نقصان فوج کی حکمرانی کے ادوار میں ہوا ہے۔ یہی جدید تاریخ کا فیصلہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی فوجی حکومتیں قائم ہوئی ہیں، وہاں فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیت بھی تباہ ہوئی ہے اور ملک کے سیاسی اور معاشی مسائل بھی اصلاح سے محروم اور خرابیوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔

فوجی حکومتوں کے لانے اور باقی رکھنے میں بیرونی طاقتوں کا بھی ہاتھ رہا ہے اور جہاں بیرونی ہاتھ نہ بھی ہو، وہاں پر بھی فوجی حکمران اپنی تربیت، صلاحیت، مزاج، عزائم ہر اعتبار سے سیاسی قیادت فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ چلی، برازیل، ارجنٹائن، گوئٹے

مالا، برما، انڈونیشیا، مصر، شام، یوگنڈا، ترکی، کانگو، نائیجیریا، گھانا، یونان، غرض دنیا کے کسی بھی گوشے میں دیکھ لیا جائے، سیاست میں فوج کی مداخلت ملک اور فوج دونوں کے لیے تباہ کن رہی ہے۔ بڑے محکم شواہد اور دلائل کی بنیاد پر دنیا اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ فوج کا کردار دفاع وطن ہے اور اسی میدان میں رہ کر وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ سیاست میں آ کر اس کا پیشہ ورانہ کردار مجروح ہوتا ہے اور وہ پوری قوم کی فوج نہیں رہتی۔ اس کا سیاسی کردار اسے متنازع بنا دیتا ہے اور قوم اور فوج میں کش مکش کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

فوج کی ذہنی ساخت (mindset) سول نظام کے تقاضوں سے نا آشنا اور اس کے لیے ناموزوں ہے۔ فوج جب سیاست میں داخل ہوتی ہے تو وہ یہاں بھی اسی مزاج کا مظاہرہ کرتی ہے جو فوج کے اپنے دائرے میں تو مناسب بلکہ ضروری ہے مگر عوامی اور سیاسی میدان کے لیے قطعاً ناموزوں ہے۔ اس سے تصادم بھی جنم لیتا ہے اور مسائل بھی اُلجھتے اور گھمبیر شکل اختیار کرتے ہیں جو بالآخر جبر و تشدد اور جمہوریت اور حقوق انسانی کی پامالی پر منتج ہوتے ہیں۔

جنرل پرویز مشرف بھی وحدتِ اقتدار کی بات کرتے ہیں جو فوجی ذہن کا فطری حصہ ہے، لیکن جمہوریت نام ہے مختلف عناصر اور تصورات میں توافق اور تعاون کا۔ اختلاف ہی جمہوریت میں اتحاد کی راہیں نکالتا ہے، اس کے برعکس فوج میں اصل چیز اجتماعیت، نظم اور اطاعت ہے۔ انفرادیت جو جمہوریت کی بنیاد ہے وہ فوج میں مطابقت (conformism) کی ضد ہے۔ یہی وہ بات ہے جو فوجی ذہن کو سیاست کے لیے غیر موزوں بنا دیتی ہے۔ جو چیز ایک نظام کی روح اور اس کی تقویت کا باعث ہے وہی دوسرے نظام کے لیے سخت ناموزوں اور فساد کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں درجنوں تحقیقی کتب اور مقالات خصوصیت سے گذشتہ ۵۰ سال کے تجربات کی روشنی میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جب تک فوج سول نظم کے تابع نہ ہو کوئی مستحکم جمہوری نظام وجود میں

نہیں آسکتا- اگر سول کو فوج کے تابع کر دیاجائے یا سول اور فوج کو دومساوی مراکز اقتدار قرار دے کر ان میں اشتراک کا کوئی نظام تجویز کیا جائے تو وہ ملک اور فوج دونوں کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہوتا ہے- عقلی دلائل اور تاریخی شواہد دونوں اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں۔

ریاست کے وجود، حکومت کی کامیابی، قومی سلامتی، عوامی فلاح و بہبود اور بالآخر امن، خوش حالی اور ترقی کے حصول کے لیے جہاں جائز اور مبنی برحق (legitimate) اداروں اور قیادتوں کا وجود ضروری ہے، وہیں وہ قوت قاہرہ (coercive power) بھی درکار ہے جو ان مقاصد کے حصول کے لیے ناگزیر ذریعہ ہے۔ اس کے لیے پولیس (ملکی امن وامان) اور فوج (بیرونی خطرات سے تحفظ اور دفاع) ضروری ادارے ہیں اور ایک جان دار، متوازن اور مستحکم ریاست کے قیام کے لیے فوج کا وجود اور اس کی حقیقی ضرورتوں کی فراہمی ضروری ہے۔

دو چیزوں میں فرق کرنا لازم ہے--- ایک، فوج کی حقیقی ضرورتوں اور قومی سلامتی اور حکمت عملی کے بارے میں اس کے تجزیوں اور تجاویز پر غور، نیز عالمی حالات اور درپیش خطرات کے ادراک کے باب میں افہام وتفہیم۔ یہ ہر ریاست کی ضرورت ہے جس کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ دوسرے، فوج کا اختیار اور اجتماعی، خاص طور پر، سول معاملات میں اس کا کردار ہے۔ پہلی ضرورت ہر ملک اور قوم کو بطریق احسن پوری کرنی چاہیے اور اس کے لیے مناسب ادارے ہونے چاہییں۔ اصل بحث دوسرے مسئلے کے بارے میں ہے اور اس میں صحیح راستہ ایک اور صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ فوج کو سول نظام کے تابع ہونا چاہیے۔ جہاں بھی فوج سول نظام کی گرفت سے باہر ہوئی ہے یا اس پر قابض یا شریک اقتدار ہوئی ہے، اس سے خرابی رونما ہوئی ہے۔ مجوزہ آئینی ترامیم میں جو چیز قابل اعتراض اور سخت خطرات کی حامل ہے وہ یہی دوسری چیز ہے۔

پاکستان کے دستور نے فوج کے کردار کو صاف لفظوں میں متعین کر دیا ہے اور اس

میں کوئی تبدیلی ملک اور فوج دونوں کے لیے سخت نقصان دہ ہوگی اور ایک نہ ختم ہونے والی کش مکش کو جنم دے گی، جو ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔

دستور کی دفعہ ۲۴۳ فوج کے قیام، مرکزی حکومت کے اس پر کنٹرول، صدر مملکت کی سپریم کمانڈ اور اہم عہدوں کے تقرر کے بارے میں ہے۔ دفعہ ۲۴۴، حلف کے سلسلے میں ہے جس میں سیاست سے مکمل احتراز کا عہد ہے۔ دفعہ ۲۴۵، سب سے اہم ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

> مسلح افواج وفاقی حکومت کی ہدایات کے تحت بیرونی جارحیت یا جنگ کے خطرے کے خلاف پاکستان کا دفاع کریں گی یا قانون کے تابع، شہری حکام کی امداد میں جب ایسا کرنے کے لیے طلب کی جائیں، کام کریں گی۔

پھر دفعہ ۶، اس باب میں بہت واضح ہے۔ اس میں دستور کو منسوخ کرنے، منسوخ کرنے کی کوشش کرنے یا اسے غیر موثر بنانے اور کسی صورت میں اس کی تخریب کرنے یا تخریب کرنے کی کوشش کرنے کو بدترین غداری (high treason) قرار دیا گیا ہے۔

اس طرح دستور نے فوج پر سول کنٹرول کے اصول کو محکم انداز میں پاکستان کی ریاستی پالیسی کے طور پر طے کر دیا ہے۔ فوج یا سول سروس سے متعلق افراد کو ملازمت ختم ہونے کے دو سال بعد عام سیاسی راستے سے سیاست میں شرکت کی اجازت دی ہے۔ اس سے ہٹ کر کسی شکل میں اس کی اجازت نہیں دی۔

ایک آزاد و خود مختار ملک کے لیے فوج کا وجود ضروری ہے۔ اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور اس کے تجربے اور حالات کے جائزے سے فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے، لیکن یہ بات سمجھنا چاہیے کہ ریاست اور معاشرے کے معاملات طے کرنے اور خصوصیت سے جمہوری نظام کے فریم ورک میں یہ ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے جن صلاحیتوں، جن تجربات اور جن طریقوں کی ضرورت ہے وہ فوج اور اس کے نظام کار سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ فوج، قومی سلامتی کے ایک پہلو: دفاع یعنی، جنگ اور بیرونی عسکری مداخلت کے مقابلے کی تربیت پاتی ہے اور اس کے افراد کی نفسیات سے لے کر اس کے پورے نظام

کا رتک اصل محور صرف یہی ہدف رہتا ہے، جب کہ سیاسی نظام، اور خصوصیت سے جمہوری نظام میں، قومی سلامتی کا تعلق عسکری پہلو کے ساتھ معاشی، معاشرتی، سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی پہلوؤں سے بھی ہوتا ہے۔ سیاسی اور جمہوری نظام کے پیش نظر صرف ریاست اور حکومت ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے اور افرادِ معاشرہ کی سلامتی اور فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ یہ ایک بالکل دوسرا ہی تصور ہے جس کے لیے بالکل دوسری قسم کی ذہنیت، تربیت اور نظام کار درکار ہے۔ انسانی تاریخ کے دوسو سالہ تجربات کا حاصل بھی یہی ہے۔

دوسری جنگ کے بعد آزادی کی تحریکوں کے نتیجے میں ۱۵۰ سے زیادہ نئے ملک وجود میں آئے اور ان میں مختلف سیاسی نظاموں کے تجربات ہوئے، جن میں فوجی حکومتوں کے قیام اور فوج کے مستقل سیاسی کردار کی مختلف شکلوں کا تجربہ بھی شامل ہے۔ مغربی استعمار اور اشتراکی تحریک دونوں نے اس بارے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ اس لیے گذشتہ ۵۰ برسوں میں اس موضوع پر کثیر لٹریچر وجود میں آیا ہے۔ بالآخر اس پر اہل علم کا اجماع سا ہو گیا کہ ''فوج کے لیے اصل کردار فوجی ہے، سول حکمرانی نہیں''۔ وہی فوج بہتر اور وہی معاشرہ جمہوری اور فلاحی مقاصد کو حاصل کر سکے گا جس میں فوج سول کنٹرول میں ہو۔ اس سلسلے میں ہارورڈ کے مشہور سیاسی مفکر سیموئیل ہن ٹنگٹن کی کتاب The Soldier and the State: The Theory and Practice and Civil Military Relations, Berkeley University Press, 1957 اور بی رونیلٹ کی کتاب Controlling the Sword: The Deomcratic Governance of National Security, Harvard Univeristy Press, Cambridge MA, 1990 بہت اہم ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں اور رابرٹ جوہانسن کے اس مضمون میں جس کا حوالہ پہلے دیا گیا ہے، بڑی تفصیل سے ان وجوہ، دلائل اور تجربات کو بیان کیا گیا ہے جن کا حاصل فوج پر سول کنٹرول کا اصول ہے۔ ہن ٹنگٹن نے فوجی ذہن اور نفسیات کی صحیح عکاسی کی ہے اور اس نے ایک جملے میں پورے فوجی ذہن اور خود ہمارے جرنیل صاحب کے ذہن کی حقیقی عکاسی کر دی ہے۔

اس کو جمہوریت کا مخالف بھی خیال کیا جاتا ہے اور وہ معاشرے کی تنظیم، سلسلہ احکامات (chain of command) کی بنیاد پر کرنا چاہتا ہے۔ (ص ۶۰)

ہن ٹنگٹن پوری بحث کا اصولی نتیجہ اس طرح پیش کرتا ہے:

فوجی افسران کو سیاسی طور پر غیر جانب دار رہنا چاہیے۔ (ص ۷۱)

وہ فوجی قیادت کے وظیفے کو تین نکات میں بیان کرتا ہے: ۱- سلامتی کی حقیقی ضرورتوں کا ادراک اور ان کو سیاسی قیادت کے سامنے پیش کرنا، ۲- سلامتی کے حالات اور خطرات کے بارے میں اپنے خصوصی نقطۂ نظر کے بیان کے ذریعے سیاسی قیادت کی مدد کرنا۔ ۳- جو فیصلہ سیاسی قیادت کرے، اسے نافذ کرنا۔

فوج کا کام کاروبارِ سیاست چلانا نہیں۔ مصنف کتاب کو اس نتیجے پر ختم کرتا ہے:

فوجیوں پر جو امن کے محافظ ہیں، بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ سب سے بڑی خدمت یہ انجام دے سکتے ہیں کہ اپنے آپ سے سچے رہیں اور فوجی روایت کے مطابق خاموشی اور جرأت سے خدمت کریں۔ اگر وہ فوجی روایت کو مجروح کرتے ہیں تو وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں اور بالآخر اپنی قوم کو۔ (ص ۴۶۶)

یہ سب اس لیے کہ فوج سیاست میں آ کر ملک کی فوج نہیں رہ سکتی۔ اگر جرنیل سیاسی اقتدار حاصل کر لیں تو ان کا حشر بھی ان انقلابیوں کا سا ہوتا ہے جو نظریے کے نام پر اقتدار میں آتے ہیں اور نظریہ ہی ان کا پہلا شکار ہوتا ہے۔

جنرل اور ایڈمرل، نہ کہ پیشہ ورانہ فوجی اخلاق، فتح یاب ہوتے ہیں۔ سیاسی طاقت کا اثر ان کو اچھا لبرل، اچھا فاشسٹ یا اچھا کمیونسٹ بنا سکتا ہے لیکن وہ خراب پیشہ ور ہوں گے۔ پیشہ ورانہ کارکردگی اور پیشہ ورانہ ضابطے کی پابندی کے اطمینان کی جگہ، اقتدار، منصب، دولت، مقبولیت اور غیر فوجی گروہوں کی تحسین سے ملنے والا اطمینان لے لیتا ہے۔ (۹۵)

کانٹے کی بات یہ ہے کہ:

سول کنٹرول، جمہوری عمل کی شناخت ہے، جب کہ فوجی کنٹرول مطلق العنان اور کلی حکومت سے پہچانا جاتا ہے۔ (ص ۸۲)

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فوجی اور سول دائروں کا مکمل ادغام جرمنی میں نازی دور میں ہوا اور اشتراکی نظام میں بھی فوج اور پارٹی میں گہرا رشتہ تھا۔ جمہوری نظام میں فوج کو سول حکومت کے تابع رکھا جاتا ہے اور یہی چیز فوج کی پیشہ ورانہ مہارت کی ضامن ہے۔ ہن ٹنگٹن نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

معروضی طور پر دیکھا جائے تو سول کنٹرول سے فوجی پیشہ ورانہ مہارت کا معیار اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ زیادہ درست بات یہ ہے کہ فوجی اور سول گروہوں میں سیاسی طاقت کی تقسیم سے افسران کو پیشہ ورانہ رویے اختیار کرنے میں تقویت ملتی ہے۔

رابرٹ جوہانسن نے انتباہ کیا ہے:

مستحکم جمہوری معاشروں میں بھی جمہوریت کو شاید سب سے زیادہ عصری چیلنج فوجی دائرے میں درپیش ہے۔ ('Prospects for Democracy' ص ۲۱۳)

معاشرے میں عسکری ذہن جس حد تک سرایت کرتا ہے مطلق العنانیت مضبوط ہوتی ہے اور جمہوریت کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے درمیان سیاسی لحاظ سے مقابلے کے عمل کو جمہوریت کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ یہ عمل داخلی اور عسکری مسائل پر سیاسی لحاظ سے پھر ممکن نہیں ہوتا۔ (ص ۲۱۶-۲۱۷)

جوہانسن جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ یہ ہے:

ہمیں چاہیے کہ جمہوریت کے تقاضوں کے تحت فوجی مطالبات کو محدود کریں بجائے اس کے کہ فوجی مطالبات کے تحت جمہوری تقاضوں کو محدود کریں۔ (ص ۲۳۰)

جوہانسن کے خیال میں ''قومی سلامتی'' کے جمہوری تصور کی تفہیم ضروری ہے، تاکہ نظام حکومت فوجی ذہن کی گرفت سے نکل کر حقیقی جمہوری تقاضوں اور تمام انسانوں کی فلاح

و بہبود کے لیے سرگرم ہو سکے۔ یہ صرف سیاسی قوتوں کی بالادستی ہی میں ممکن ہے۔

اس بحث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ صدر مملکت کا آرمی چیف آف اسٹاف رہنا اور پارلیمنٹ، وزیراعظم اور صوبائی منتخب نظام کے سر پر کسی بھی عنوان سے ایک غیر منتخب ''قومی سلامتی کونسل'' کا وجود ملک کو سول حکمرانی کے نظام سے ایک قسم کی فوجی حکمرانی کے نظام کی طرف لے جائے گا جو جمہوریت کی نفی، وفاقیت کی موت اور فوج کے لیے کمزوری بلکہ تباہی کا راستہ ہے۔ بی این آر کی دستاویز میں بڑے معصوم انداز میں اس ادارے کو ''مشاورتی ادارہ'' قرار دیا گیا ہے، حالانکہ اپنی ترکیب اور تاریخی پس منظر کے اعتبار سے عملاً یہ فوجی صدر کی اصل کابینہ کا کردار ادا کرے گی اور اس طرح ملک جمہوری قبا میں مارشل لا کے نظام کے تحت آجائے گا جو ترقی معکوس کی بدترین شکل ہوگی۔

قومی سلامتی کونسل کے سلسلے میں ترکی اور امریکہ کی مثالیں دی گئی ہیں۔ لیکن یہ مغالطہ دینے کی ایک افسوس ناک کوشش ہے۔

ترکی کی مثال : جہاں تک ترکی کا معاملہ ہے، وہاں جنرل کنعان ایورن کے مارشل لا میں جو نیا دستور بنایا گیا اس میں ایک ایسی کونسل بنائی گئی جس میں نصف سویلین اور نصف فوجی ہیں۔ اس کا ایجنڈا صدر، وزیراعظم یا آرمی چیف کے مشورے سے بناتا ہے اور یہ کابینہ یا پارلیمنٹ کو مشورہ دیتی ہے۔ اس کا خاص پس منظر یہ ہے کہ پہلے دن سے جدید ترکی میں فوج کا ایک خاص کردار رہا ہے۔ دولت عثمانیہ کے انتشار کے وقت یہ ترکی فوج تھی، جس نے یورپ کی استعماری طاقتوں کا مقابلہ کرکے اناطولیہ اور تھوڑے سے مزید علاقے کو آزاد رکھا اور جدید ترکی کی ریاست قائم ہوئی۔ اس وقت سے ترکی کی فوج ایک خاص کردار ادا کر رہی ہے لیکن دوسرے ممالک میں فوج کی یہ تاریخی پوزیشن نہیں۔ اس کے باوجود ترکی میں کونسل کے ۲۰ سالہ تجربے پر سیاسی حلقوں میں شدید اضطراب اور اختلاف ہے اور ترکی کے ایک جمہوری ریاست کی حیثیت سے ترقی کرنے کی راہ میں یہ ادارہ رکاوٹ ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں پر نہ سیاسی استحکام آیا اور نہ معاشی استقرار، بلکہ سیاسی اُلٹ پلٹ میں اس کا ایک کردار رہا ہے جو عدم استحکام کا ذریعہ بنا ہے۔ کوئی بھی غیر جانب

دار مبصر اسے ترکی کے حق میں ایک سراسر خیر قرار نہیں دے سکتا۔ اس وقت ترکی میں جو سیاسی مباحث ہو رہے ہیں ان میں فوج کے کردار پر نظر ثانی کی بات کو فوقیت حاصل ہے۔ ہمارے لیے ترکی کا یہ ادارہ کسی اعتبار سے بھی مثال نہیں بن سکتا۔

امریکہ کی مثال : جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے، وہاں نیشنل سیکورٹی کونسل کی تاریخ، کردار اور کارکردگی اس سے قطعاً مختلف بلکہ اس کی ضد ہے جو ہمارے یہاں تجویز کی جا رہی ہے۔ تعجب ہے کہ این بی آر کی دستاویز میں سب سے پہلے امریکہ کی نیشنل سیکورٹی کونسل ہی کا ذکر ہے۔ کیا فی الحقیقت جنرل پرویز صاحب کے اس مرکز دانش (think tank) کی معلومات کا یہی حال ہے کہ وہ اس ادارے کی تاریخ اور کردار کو اپنے لیے نظیر بنانے کی جسارت کر رہے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں آزادی کی جنگ فوج نے لڑی، لیکن دستور اور دستوری اداروں میں اس کا کوئی کردار نہ تھا۔ ابراہام لنکن کے زمانے میں فوج ہی نے سول وار کو ختم کیا تھا لیکن اس کے بعد بھی فوج کا کوئی سیاسی یا دستوری کردار نہیں رکھا گیا تھا۔ یہی صورت حال ۱۹۴۰ء تک رہی۔

البتہ دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹ء) کے دوران غیر محسوس اور ماورائے قانون انداز میں حکومت کے معاملات میں فوج کا عمل دخل بڑھ گیا۔ جوائنٹ چیف کا ادارہ ایک عسکری کمانڈ کا ادارہ ہی نہ رہا، بلکہ اس کا سیاسی کردار بھی ایک حقیقت بن گیا۔ اس کا سربراہ تمام فوجی امور میں عملاً صدر کا مشیر بن گیا اور اس نے اتنے بال و پر نکال لیے کہ وہ ایک متبادل تو نہیں لیکن قابل ذکر اور بااثر مستقل بالذات اساسِ قوت (power base) بن گیا اور جنگ ختم ہو جانے کے باوجود سرد جنگ کے بہانے اس نے سیاسی قوت کے ایک مرکز کی شکل اختیار کر لی۔

۱۹۴۷ء کا نیشنل سیکورٹی ایکٹ اور اس کے بعد ۱۹۴۹ء اور بعد کی ترامیم کے ذریعے جوائنٹ چیف کے اس فوجی ادارے کے پر کاٹے گئے اور بالآخر اسے اس کی حدود میں لا کر مکمل طور پر سیاسی قیادت کے قابو میں لے آیا گیا۔ نیشنل سیکورٹی کونسل بھی اصلاً ایک سیاسی

ادارہ ہے اور اس کے تمام ارکان (سوائے ایک چیف آف جوائنٹ اسٹاف کے) سویلین ہیں۔ اس کا مقصد فوج کی شرکت یا مشاورت نہیں' ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان جو حجم اور جو کام (function) فوج کے اعلیٰ ادارے نے حاصل کر لیے تھے' ان سے گلوخلاصی تھا۔ اس کے لیے نصف درجن سے زیادہ اقدام کیے گئے۔

○ اول: وزارت دفاع کی تنظیم نو کی گئی۔ جوائنٹ چیف جو براہ راست امریکی صدر کو عسکری امور پر مشورہ دیتا اور حالات سے باخبر رکھتا تھا' اسے وزارت دفاع کے سیکرٹری سے جو سویلین ہوتا ہے' مربوط کیا گیا۔ سیکرٹری دفاع کو جوائنٹ چیف کی میٹنگ میں شرکت کا حق دیا گیا' جو بعد میں بڑھا کر اس کی صدارت میں کر دیا گیا۔ جب فوج میں اس پر کچھ تحفظات کا اظہار ہوا تو سیکرٹری دفاع کو فوج کا ڈپٹی کمانڈر ان چیف بنا دیا گیا۔ اور اس طرح پنٹاگون کو سول نظام کے تحت لے آیا گیا۔ اب سیکرٹری دفاع' نہ کہ جوائنٹ چیف' صدر کا عسکری امور پر مشیر اعلیٰ ہے' اسی طرح حکمت عملی اور تجزیہ' سیکرٹری دفاع کی ذمہ داری قرار دی گئی اور جوائنٹ چیف کا دائرہ کار فوجی امور اور پیشہ ورانہ معاملات تک محدود کر دیا گیا۔

○ دوم: قومی سلامتی کونسل قائم کی گئی' جو کوئی دستوری ادارہ نہیں بلکہ ملکی قانون کے تحت ایک ادارہ ہے جس کا مقصد صدر کو سلامتی کے امور پر مشورہ دینا ہے۔ پہلے تمام افواج کے سربراہوں کا صدر سے براہِ راست رابطہ تھا۔ اب جوائنٹ چیف اپنی مجلس میں جو تجاویز طے کریں گے' انھیں صرف ان کا سربراہ' قومی سلامتی کونسل میں لاتا ہے۔ صرف وہی ایک فرد کونسل کا رکن ہے' باقی تمام ارکان سویلین ہیں۔ عام حالات میں جوائنٹ چیف' سیکرٹری دفاع اور قومی سلامتی کونسل کو حالات سے آگاہ کرتا ہے اور اس طرح صدر تک راست پہنچ میں' جو ۴۷-۱۹۴۰ء میں معمول کا درجہ اختیار کر گئی تھی' قرار واقعی کمی ہوئی۔ امریکہ میں کانگریس کو کنٹرول کرنے یا متاثر کرنے کے باب میں قومی سلامتی کونسل کا کوئی کردار نہیں۔ وہ صرف قومی سلامتی اور حکمت عملی کے امور پر توجہ مرکوز رکھتی ہے۔ یہ ایک خالص سول ادارہ ہے۔ امریکہ میں صدر' سینیٹ یا کانگریس کو برطرف نہیں کر سکتا اور نہ

ان کے انتخابات کے انعقاد میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے۔

○ سوم: ۱۹۴۷ء-۱۹۴۰ء میں جوائنٹ چیف کے سپرد صرف صدر کو مشورہ دینے اور فوج کے پیشہ ورانہ امور ہی شامل نہ تھے' بلکہ مالیاتی اور انتظامی معاملات بھی اس کے پاس تھے۔ اس طرح وہ ایک تقریباً خودمختار مرکز قوت بن گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے قانون کے تحت ایک نیا ادارہ Office of the Comptroller (دفتر ناظر حسابات) بنایا گیا' جس نے جوائنٹ چیف سے انتظامی اور مالی معاملات کا چارج لے لیا۔ بعد میں ایک سویلین اسسٹنٹ سیکرٹری دفاع اس شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔

○ چہارم: جنگ کے زمانے میں معلومات' خفیہ اطلاعات اور ملٹری ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کے تمام کام بھی جوائنٹ چیف کے ماتحت تھے' اور اس طرح معلومات اور تجزیے پر اسے مکمل کنٹرول تھا۔ ۱۹۴۷ء کے سیکورٹی ایکٹ کے تحت یہ سارا کام بھی جوائنٹ چیف سے لے لیا گیا۔ خالص عسکری معلومات اور تحقیق کا کام سیکرٹری ڈیفنس کے تحت دے دیا گیا۔ جبکہ عام سلامتی کے حوالے سے خفیہ معلومات کے لیے ایک نیا ادارہ سی آئی اے بنایا' جو جوائنٹ چیف کے بجائے قومی سلامتی کونسل سے مربوط کیا گیا۔

○ پنجم: جنگ کے زمانے میں ایٹمی توانائی اور جوہری ہتھیاروں کا پورا نظام جوائنٹ چیف کے تحت تھا۔ لیکن بڑی ردوکد اور بحث ومباحثے کے بعد ۱۹۴۶ء میں میک موہن ایکٹ کے ذریعے سے یہ سارا کام بھی ایک سویلین اٹامک انرجی کمیشن کے سپرد کر دیا گیا' جو براہ راست صدر کے تحت کام کرتا ہے۔

○ ششم: جوائنٹ اسٹاف جرمنی' جاپان اور تمام مفتوحہ علاقوں پر حکمرانی کا اختیار رکھتے تھے' وہ بھی ان سے لے لیا گیا۔

○ ہفتم: جنگی ساز وسامان وغیرہ کی پیداوار کا وہ کام جو جنگ کے دوران جوائنٹ اسٹاف کے تحت تھا اور اس میں صرف اسلحہ ہی نہیں معاشی پیداوار بھی شامل تھی' وہ بھی ان کے دائرے سے نکال کر صدر کے انتظام میں دے دیا گیا۔

اس طرح دراصل قومی سلامتی ایکٹ اور دوسرے قوانین اور انتظامی احکام کے

ذریعے فوج کے سول معاملات ہی نہیں خود فوجی معاملات میں بھی کردار کو کم کیا گیا۔ یوں قومی سلامتی کے تمام امور کو فوج کے انتظام سے نکال کر سول نظام میں دے دیا گیا۔ قومی سلامتی کونسل اس نظام کا ایک اہم ذریعہ رہی ہے۔ پروفیسر سیموئیل ہن ٹنگٹن نے اس کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے:

> صدر کو قومی سلامتی کی پالیسی کے بارے میں مشورہ دینے کی ذمہ داری جو جنگ کے دوران جوائنٹ چیف آف اسٹاف نے ادا کی تھی، نیشنل سیکورٹی کونسل کو تفویض کر دی گئی جس میں اعلیٰ ترین سول افسران شامل ہیں۔ جوائنٹ چیفس کو فوجی سرگرمیوں تک محدود کرنے میں اس ایجنسی کے قیام نے کسی بھی دوسرے تنظیمی اقدام کے مقابلے میں زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ (ص ۴۳۴)

ان تمام تبدیلیوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ جوائنٹ چیف اور ان کا چیئرمین صرف ''فوجی نقطۂ نظر'' کی ترجمانی تک محدود ہو گئے۔ اس طرح عسکری بجٹ کے پورے عمل سے رفتہ رفتہ جوائنٹ چیف کو عملاً بے دخل کر دیا گیا اور کمپٹرولر کے دفتر نے یہ سارا نظام سنبھال لیا۔ اس کے ساتھ جوائنٹ چیف پارلیمنٹ کی کمیٹی برائے افواج کے سامنے جواب دہ بھی ہیں۔ اور ان کا بجٹ بھی کانگریس کے تابع ہے اور تمام اخراجات متعلقہ کمیٹی کے ذریعے ہوتے ہیں۔ ہن ٹنگٹن کے الفاظ میں ۱۹۴۵ء میں یہ کیفیت تھی کہ جوائنٹ چیف آف اسٹاف ایک مرکز قوت تھے۔ ایڈمرل لی لی (Lealy) کے الفاظ میں: ''کسی بھی طرح کے سول کنٹرول میں نہیں''۔ لیکن اس پورے عمل کا مقصد ان کو دوبارہ فوج کے دائرے میں لے آنا تھا۔

> لہٰذا بنیادی ضرورت یہ تھی کہ جوائنٹ چیفس کو ان کے غیر فوجی وظائف سے ہٹا کر صرف فوجی امور تک محدود کیا جائے اور ایسے مناسب ادارے تشکیل دیے جائیں جو انتظامی امور، پالیسی اور حکمت عملی سے متعلق ذمہ داریوں کو ادا کریں۔ (ص ۴۲۸)

امریکہ نے فوج کو ایک پیشہ ورانہ فوج رکھنے کے لیے وہ تمام اقدام کیے جس کے نتیجے میں سول کنٹرول دوبارہ قائم ہو گیا۔ ہمارا قومی ادارہ تعمیر نو اور جنرل پرویز مشرف بالکل

اس کے برعکس ''کارنامہ'' انجام دینا چاہتے ہیں اور سول نظام پر فوج کا کنٹرول قائم کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے امریکہ کی مثال پیش کرنے کی جسارت بھی کرتے ہیں۔ اس بحث کی روشنی کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ قومی تعمیرِ نو بیورو امریکہ میں ان اداروں کے قیام کی غرض و غایت اور تاریخ سے واقف نہیں یا قوم کو مغالطہ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ دونوں رویے ناقابل معافی جرم ہیں۔

پارلیمانی نظام کا مسئلہ

چوتھا مسئلہ پارلیمانی نظام کا ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ کون سا نظام اچھا ہے: پارلیمانی یا صدارتی۔ اس بحث کے دور سے ملک گزر چکا ہے اور اس پر قومی اتفاق رائے ہے کہ ہمارے لیے پارلیمانی نظام ہی بہتر ہے اور صدارتی انتخاب کے جو دستوری (جنرل ایوب کے دس سال) اور غیر دستوری (جنرل یحییٰ، صدر بھٹو، جنرل ضیاالحق اور جنرل پرویز مشرف) ادوار کا تجربہ ہے، وہ بھی شاہد ہے کہ صدارتی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ اصل خرابی دستوری نظام میں نہیں اس پر عمل کرنے والوں اور ان کے طور اطوار میں ہے۔ پارلیمانی نظام میں اس کے فریم ورک کو متاثر کیے بغیر تحدید و توازن برقرار رکھنے کے لیے بہت سے ضابطے موجود ہیں اور ان میں مزید بہتری پیدا کی جاسکتی ہے۔ پارلیمنٹ اس پر بحث اور غور کر سکتی ہے اور دنیا کے دستوری تجربات کی روشنی میں دسیوں مشورے دیے جاسکتے ہیں۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وزیراعظم ہوں یا صدر مملکت، کوئی بھی اپنے دائرہ کار میں رہ کر قانون اور روایات کے مطابق کام نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اپنے ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ طاقت لے کر اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے۔

اس وقت جو ترامیم پیش کی گئی ہیں وہ پارلیمانی نظام کا حلیہ بگاڑ دیں گی۔ پارلیمنٹ، وزیراعظم اور اس کی کابینہ صدر کے سامنے تابع مہمل کا مقام اختیار کر لیں گے، اس کے خوف کے تحت زندگی گزاریں گے اور عوام کے حق حکمرانی (مینڈیٹ) کے کوئی معنی باقی نہیں رہیں گے۔ صدر کسی براہ راست رائے دہندگی کی بنیاد پر منتخب نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت علامتی ہے،

لیکن ان ترامیم کے ذریعے اسے ''قادر مطلق'' بنایا جا رہا ہے۔ جو صواب دیدی اختیارات اس کو دیے جا رہے ہیں وہ جنرل ایوب اور جنرل ضیا الحق دونوں کے خود حاصل کردہ اختیارات سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ وزیراعظم وہ اپنی مرضی سے نامزد کر سکتے ہیں جسے چھ مہینے ملیں گے کہ جوڑ توڑ کے ذریعے اپنا الو سیدھا کر لے۔ صدر صاحب جب چاہیں اسمبلی کو، یا وزیراعظم کو، یا اس کی کابینہ کو برطرف کر سکتے ہیں۔ تمام اہم عہدوں پر تقرری کا مکمل اختیار ان کو ہوگا۔ یہی معاملہ صوبوں میں گورنروں کے تقرر کا ہے۔ پھر ان کے نامزد گورنروں کو اسی طرح صوبوں میں وزیراعلیٰ بنانے اور اسمبلیوں کو قابو میں رکھنے کا اختیار ہوگا۔ بظاہر وہ غیر انتظامی (non executive) صدر ہوں گے، لیکن فی الحقیقت اصل حکمران وہی ہوں گے، اور ہلانے والے تمام تار ان کی انگلیوں میں ہوں گے۔

اپنی اصل میں یہ ایک صدارتی نظام ہے، جس پر ایک طرف ملٹری کی قوت کا سایہ ہے تو دوسری طرف وہ ہر اس پابندی اور تحدیدات سے آزاد ہوگا جو صدارتی نظام کو بھی کچھ حدود کا پابند کرتا ہے۔ صواب دیدی اختیارات ہی دراصل مطلق العنان حکومت کی جڑ ہے۔ ان ترمیمات کے ذریعے ایک ایسا صدر تراشا جا رہا ہے جو ہر گرفت سے بالا ہو اور من مانی کر سکے اور کروا سکے۔

کسی بھی پارلیمانی نظام کی کم سے کم خصوصیات یہ ہیں:

۱- بااختیار پارلیمنٹ، جو عوام کے براہِ راست ووٹ سے ایک متعین مدت کے لیے منتخب ہو اور عوام اس میں سیاسی جماعتوں کو ان کے منشور کی بنیاد پر محدود حکمرانی کا اختیار دیں۔ یہ حدود یا دستور مقرر کرتا ہے یا عوامی مینڈیٹ۔

۲- انتظامیہ اپنے اختیارات اور حق حکمرانی، پارلیمنٹ سے حاصل کرتی ہے اور اسی کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ وزیراعظم ان کا منتخب کردہ اور کابینہ ان میں سے اور ان کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔

۳- وزیراعظم اور کابینہ/انتظامیہ کو ہٹانے کا اختیار منتخب پارلیمنٹ کو حاصل ہوتا ہے جو ان کی کارکردگی پر بلاواسطہ یا اپنی منتخب کردہ کمیٹیوں کے ذریعے مسلسل نظر

رکھتی ہے۔ صدارتی نظام کے برعکس، پارلیمانی نظام میں قانون ساز ادارہ اور انتظامیہ میں وظائف کے اعتبار سے تو فرق پایا جاتا ہے، لیکن افراد کا اشتراک ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں صدارتی نظام میں وظائف کی علیحدگی کے ساتھ افراد کی علیحدگی بھی ہوتی ہے۔

اب دیکھیے، ان مجوزہ ترامیم کے ذریعے پارلیمنٹ اور انتظامیہ دونوں کی کس طرح قلب ماہیت کی گئی ہے:

۱- پارلیمنٹ خود وزیراعظم/ اپنا قائد منتخب نہیں کرے گی، بلکہ صدر کسی شخص کو نامزد کردے گا جو چھے ماہ میں اعتماد کا ووٹ لے گا۔

۲- وزیراعظم اور پارلیمنٹ، کابینہ کی تشکیل کریں گے لیکن صدر جب چاہے وزیراعظم یا کابینہ کو برطرف کرسکتا ہے۔

۳- قومی سلامتی کونسل کا غیر منتخب ادارہ پارلیمانی نظام کے قانونی اور انتظامی عمل کے ادغام کے اصول کی نفی کرتا ہے۔

۴- وزیراعظم، انتظامیہ کا سربراہ ہوگا جس کے معنی ہیں کہ فوج اور سول دونوں کی پوری انتظامیہ اس کے ماتحت ہوگی، لیکن وہ ان میں سے کسی کے بھی سربراہ کو نہ مقرر کرسکتا ہے اور نہ ہٹا سکتا ہے، بلکہ یہ پوری ٹیم اس پر صدر اپنی صواب دید سے مسلط کرتا ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ پوری انتظامیہ صدر کے ہاتھ میں ہوگی اور وزیراعظم ایک بے اختیار فرد بن کر رہ جائے گا۔ صدر کے لیے بھی کوئی ضابطہ، کوئی قانون اور کوئی راہنما اصول نہیں ہے۔ ہر کام وہ اپنی صواب دید میں کرنے کا مجاز ہے۔ فوج کے چاروں سربراہوں کا تقرر، گورنروں کا تقرر، پبلک سروس کمیشن کے سربراہ کا تقرر، الیکشن کمیشن کے سربراہ کا تقرر۔

۵- اسی طرح صوبوں میں گورنر وہ سارے اختیارات رکھیں گے جو مرکز میں صدر کو حاصل ہیں اور برطرفی کے اقدامات وہ صدر کے مشورے سے کریں گے۔

جب اقتدار کا نقشہ بنانے اور بگاڑنے' اہم تقرریاں کرنے اور ان میں تبدیلی کے تمام اختیارات صدر کو دے دیے گئے اور صدر محض اپنے اختیار سے چیف آف آرمی اسٹاف بھی رہ سکتا ہے تو پھر اس نظام میں پارلیمانی نظام کی کون سی خصوصیت باقی رہ گئی؟

جو نقشہ تجویز کیا گیا ہے اس میں صدر کی بالادستی اور شخصی حکمرانی کا پورا پورا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس نظام کو چلانے کے لیے جوڑتوڑ' سیاسی صف بندیاں' وفاداریوں کی تجارت اور سرپرستی کی سیاست راہ پائے گی۔ کیونکہ ایسے غیر فطری اور غیر جمہوری نظام کے چلنے کا انحصار صرف انھی حربوں پر ہے۔ نہ سیاسی جماعتیں مضبوط ہو سکیں گی اور نہ کوئی جمہوری روایات پنپ سکیں گی۔ بالفاظ دیگر یہ قومی سیاست میں انتشار اور صحت مند حکمرانی کے خاتمے کا نسخہ ہے۔

وفاقیت کا اصول

ان ترامیم سے ہمارے اختلاف کا پانچواں پہلو وفاقیت کے بارے میں ہے۔

فوجی حکومت کا ہر دور ایک وحدانی حکومت کا دور رہا ہے جو ملک میں علاقائیت اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت دینے کا باعث ہوا ہے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں وفاقی نظام کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کے ۸۰ فی صد پر آج تک عمل نہیں ہوا۔ مرکز میں ۱۴ وزارتیں ایسی ہیں جن کا کوئی جواز نہیں۔ قانون سازی میں مشترک فہرست کو بے محابا استعمال کیا گیا ہے۔ وفاق کے اہم اداروں کو وجود ہی میں نہیں لایا گیا یا غیر موثر بنا دیا گیا۔ اور اب صدر کو جو اختیارات دیے جا رہے ہیں وہ وفاقی نظام کو ایک طرح کے وحدانی نظام میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے۔

فوج کو ہم ایک قومی فوج دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں چند علاقوں کا ارتکاز ویسے بھی تشویش ناک ہے۔ لیکن فوج کے سیاسی کردار کے ذیل میں تو یہ اور بھی خطرناک اور مرکز گریز رجحانات کو تقویت دینے کا باعث ہوگا۔ گورنروں کے تقرر کو جس طرح صدر کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا گیا ہے اور پھر گورنروں کو صوبائی نظام کی شکست و ریخت میں جو کردار

دیا گیا ہے' اس سے وفاقیت کا اصول بری طرح مجروح ہوا ہے۔ ضلعی حکومتوں کے نظام (۲۰۰۱ء) نے بھی مرکز کے لے پالک کی شکل میں جنم لیا ہے اور صوبائی نظام سے اس کے ربط کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ گویا صوبوں کو دونوں طرف سے مجروح کر دیا گیا ہے۔ یہ فیڈریشن کے بنیادی تقاضوں کے منافی ہے اور اس خطرناک راستے پر بڑھنے والا ہر قدم قومی سلامتی' ملکی استحکام اور جمہوریت کے فروغ کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہے۔

عدالت نے جن تین تحدیدات کی نشان دہی کی تھی' ان ترامیم کے ذریعے ان تینوں کو پامال کر دیا گیا ہے اور اداروں کو غیر سیاسی بنانے کے اصول کی دھجیاں فوج کو واضح سیاسی کردار دے کر خود بکھیر دی گئی ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تمام انحرافات قابل گرفت ہیں۔ اسلام عدل و انصاف کے ساتھ عہد و پیمان کے احترام کا قائل ہے اور ۱۹۷۳ء کا دستور ایک میثاق ملّی کی حیثیت رکھتا ہے' جس کا ان ترامیم کے ذریعے مُثلہ کیا جا رہا ہے۔

یہ حکومت امریکی حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے شوق میں جہاد کے خلاف' دینی مدارس کے خلاف اور اسلامی ثقافت و روایات کے خلاف بڑی بے باکی سے اقدامات کرتی چلی جا رہی ہے۔ سپریم کورٹ کے شریعت بنچ سے ایک معروف اور معتمد علیہ عالم دین مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کو بیک بینی و دو گوش ہٹا کر اور اپنی مرضی کے ججوں کا تقرر کر کے سود کے حق میں مرضی کا فیصلہ لیا ہے۔ سیکولر کلچر اور سیاست کے فروغ کے اقدامات سے دستور کی اسلامی دفعات کی بھی خلاف ورزی کی ہے۔ ان ترامیم میں مخلوط طرز انتخاب کے اصول کو قوم پر مسلط کر کے اسلامی تعلیمات سے انحراف اور سیکولر اور مخلوط سیاست کی طرف قدم اٹھایا ہے۔

یہ وہ چھے وجوہ ہیں' جن کی بنیاد پر ہم ان ترامیم کو ملک و ملت کے لیے سخت نقصان دہ سمجھتے ہیں اور اس امر کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ یہ قوم ان کو اس شکل میں کبھی قبول نہیں

کرے گی۔ اگر زبردستی انھیں قوم پر مسلط کیا جاتا ہے تو ان کے خلاف سیاسی جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ان سے نجات حاصل نہیں کر لی جاتی۔

واحد راستہ: انتخابات میں بھرپور شرکت

اپنے اس ہدف اور عزم کے اظہار کے ساتھ ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں حکومت کے غلط اقدامات اور دستور و جمہوریت کے معروف اصولوں اور اسلامی اقدار کے خلاف مسلط کی جانے والی دستوری ترامیم اور سیاسی کارگزاریوں کا مقابلہ کرنے کا واحد راستہ اکتوبر کے انتخابات میں بھرپور شرکت ہے۔ اب ایک ایسی حکمت عملی پر پیش رفت کی ضرورت ہے جس سے نئی اسمبلیوں میں قوم کے حقیقی ترجمان پہنچ سکیں اور اسلام اور جمہوریت کی جنگ کو یقین، کردار اور اتحاد کے ساتھ لڑ سکیں۔

ہم سمجھتے ہیں اب عدالتی جنگ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ عدالت خود جن مشکلات اور مجبوریوں کی گرفت میں ہے، اس سے اس وقت کوئی بڑی توقع عبث ہے۔ سپریم کورٹ نے حال ہی میں ریفرنڈم اور پھر سود کے مسئلے پر جس کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے، اس نے اس پر عوام کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔ ریفرنڈم کے خلاف اپیل نے اس کو ایک تاریخی موقع دیا تھا کہ جرأت اور عزیمت کا راستہ اختیار کرتی اور کم از کم اتنا ہی کہہ دیتی کہ: ''ریفرنڈم کے ذریعے صدر کے انتخاب کی دستور میں کوئی گنجایش نہیں'' لیکن اس نے رخصت اور فرار کا راستہ اختیار کیا اور عبوری دستور کا سہارا لے کر، جس کے تحت خود عدالت نے حلف لیا تھا، اس شرم ناک کھیل کو جاری رکھنے کا جواز فراہم کر دیا جبکہ اصل مسئلے کو آیندہ دستور کی بحالی اور پارلیمنٹ پر ٹال دیا۔ سود کے معاملے میں بھی حکومت جو چاہتی تھی اس کے لیے راستہ نکال دیا گیا اور ایک بار پھر مسئلے کو وفاقی شرعی عدالت کی طرف منتقل کر دیا گیا۔

ان حالات میں عدالت کی جنگ لاحاصل ہے۔ اب تو اصل معرکہ پارلیمنٹ میں ہونا ہے اور اس کے لیے ساری توجہ انتخابات پر ہونی چاہیے۔ اس میں ایک طرف عوام کو بیدار کیا جائے، اصل مسائل سے ان کو روشناس کیا جائے اور حالات اور خطرات سے آگاہ

کیا جائے۔ دوسری طرف سیاسی اور دینی قوتیں نازک حالات اور گمبھیر خطرات کے پیش نظر اتفاق و اتحاد اور تعاون اور ہم آہنگی کا راستہ اختیار کریں تاکہ ایسے جان دار، بے داغ اور اصول کے پکے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ میں پہنچے جو پاکستان کے قیام کے اصل مقاصد کی حفاظت کر سکے، دستور کو بیخ کنی سے بچا سکے اور جنرل پرویز مشرف اور فوج کو یہ پیغام دے سکے کہ انھیں اپنی روش بدلنا ہوگی۔ جنرل صاحب کو اگر سیاست کا شوق ہے تو وردی اُتار کر آئیں اور قسمت آزمائی کریں۔ ایک جانب فوج کی ہر حقیقی ضرورت کو پورا کرنا قوم کی ذمہ داری ہے تو دوسری طرف فوج کا بھی فرض ہے کہ وہ خود کو فوجی معاملات تک محدود کرے اور دفاع وطن کے لیے پوری قوم کی امیدوں کا مرکز بن جائے۔

جنرل پرویز مشرف نے افغانستان کی پالیسی کو تبدیل کر کے دوست تو کوئی حاصل نہیں کیا، بے شمار دشمن پیدا کر لیے ہیں۔ اسی طرح اب کشمیر پر یوٹرن کے لیے پر تول رہے ہیں بلکہ آغاز کر چکے ہیں اور بھارت کو لڑائی کے بغیر اپنے مقاصد حاصل کرنے کا موقع دے رہے ہیں۔ ان کی آشیر باد سے امریکی فوجی اور ایف بی آئی کے کارندے پاکستان کی سرزمین پر اپنے مقاصد کے لیے کارروائیاں کر رہے ہیں اور کرا رہے ہیں۔ اس صورت حال نے صرف جنرل صاحب ہی نہیں پوری فوج کے تاثر اور وقار کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ہم فوج کے اصل کردار اور وقار کو بحال کرنا چاہتے ہیں اور اعتماد اور تعاون کا وہ نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں فوج اپنی آئینی اور پیشہ ورانہ حدود میں رہے اور کاروبار سیاست و ریاست میں عوام کے منتخب نمایندوں کو بالادستی حاصل ہو۔ نہ فوج کو سیاست میں دراندازی کی ضرورت اور موقع ہو اور نہ سیاست دان اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی جرأت کر سکیں۔

سیاسی جماعتوں اور کارکنوں کو بھی اس پورے بحران سے بڑے اہم سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ نئی اسمبلیوں میں ایسے افراد کے آنے اور سیاسی جماعتوں کے درمیان ایسی باہمی تفہیم کی ضرورت ہے کہ حکمت اور دانش مندی کے ساتھ ملک و ملت کو موجودہ دلدل

سے نکالا جا سکے۔ اگرچہ یہ تین سال (۲۰۰۲ء-۱۹۹۹ء) ہمارے گم شدہ سال ہیں' تاہم تلافی کے امکانات ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اب ساری توجہ' تلافی مافات اور پاکستان کی تعمیرِ نو ان اصولوں اور مقاصد کے مطابق کرنے کی جدوجہد پر صرف کی جائے جن کے لیے یہ ملک قائم کیا گیا تھا' جس کا خواب اقبال اور قائداعظم نے دیکھا تھا اور جس خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے پوری ملت اسلامیہ پاک و ہند نے ایک عظیم جدوجہد کی تھی۔ قائداعظم نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ: پاکستان کو پوری دنیا میں ایک تاریخی کردار ادا کرنا ہے' پاکستان ملتِ اسلامیہ کا حصہ اور عالم اسلام کے احیا کا نقیب ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ: پاکستان محض ایک علاقے کا نام نہیں' ایک نظریے کا علم بردار ہے جو اسلام کے نظام عدل و انصاف سے عبارت ہے اور جس کی بنیاد قرآن و سنت اور اسوۂ رسولؐ پر ہے جس میں اسلامی حدود کے اندر عوام کی حکمرانی' پارلیمانی نظام کا فروغ' حقوق انسانی کی پاس داری' معاشی عدل اور خوش حالی اور انتظامی اور فوجی خدمت کا سول حکمرانی کے تابع ہونا شامل ہے۔ یہ ہے مستقبل کے بارے میں ہمارا وژن۔

وقت کی اصل ضرورت یہ ہے کہ ایک طرف اس وژن کو عوام تک پہنچایا جائے اور دوسری طرف سیاسی عمل کے ذریعے ایک ایسی قیادت کو اسمبلیوں تک پہنچایا جائے جو اس وژن کی امین اور اس کو بروے کار لانے کی صلاحیت سے آراستہ ہو۔ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر مخالف قوت کا مقابلہ کر سکے' جو امریکی جنگ باز حکمرانوں اور بھارت کے لیے نرم نوالہ نہ بنے' جو لچک کے نام پر کسی اصول کی قربانی اور کسی مورچے سے پسپائی کی اجازت نہ دے' جو ملک کی دولت اور وسائل کو امانت سمجھے اور عوام کی خدمت اور ملک کی قوت کی تعمیر کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دے۔

عوام میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ قوم بانجھ نہیں' بلکہ اس میں اچھے لوگوں کی بڑی تعداد موجود ہے' جن کو منظم اور متحرک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ملک کو بیرونی خطرات اور اپنوں کی چیرہ دستیوں سے بچایا جا سکے اور جو خواب اس قوم نے دیکھا تھا اسے حقیقت کے روپ میں دیکھا اور دکھایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے جدوجہد اور قربانی وقت کی ضرورت

ہے اور اس جدوجہد کو 'یا تن رسد بہ جاناں' یا 'جاں زتن بر آید' کے جذبے کے تحت برپا کر کے ہم ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں اور ملت کو اس کی منزل کی طرف سرگرم کر سکتے ہیں۔

دستوری ترامیم کی لڑائی بھی اب پارلیمنٹ میں لڑی جائے گی اور جنرل صاحب پارلیمنٹ کی تائید حاصل کیے بغیر نہ اپنے تین سال کے اقدامات کے لیے تحفظ حاصل کر سکتے ہیں اور نہ آیندہ کے لیے کسی نقشے میں رنگ بھر سکتے ہیں۔ اس وقت کوئی ایسا اقدام نہیں ہونا چاہیے جو کسی کو انتخابات کو موخر کرنے یا ہائی جیک کرنے کا موقع دے۔ متحدہ مجلس عمل نے اس سلسلے میں بڑی دانش مندی سے حکمت عملی بنائی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو وسعت دی جائے۔ قوم کے تمام اچھے عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر اور باہم افہام و تفہیم کے ذریعے تصادم اور ووٹوں کی تقسیم سے بچا کر ایک ایسی سیاسی قیادت کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور دی جائے جو عوام میں سے ہو، عوام کی سچی خادم ہو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی وفادار ہو، امین اور صاحب کردار ہو اور قوم اور ملک کو ایک شان دار مستقبل کی طرف لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

یہ ایک قابل حصول ہدف ہے بشرطیکہ ہم سب ذاتی اغراض اور گروہی تعصبات سے بالا ہوں، ایک مشترک مقصد کے حصول کے لیے سرگرم ہو جائیں، حالات کے خاموش تماشائی نہ بنے رہیں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہماری قسمت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے لیے عمل اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اب بھی نہ اٹھے تو پھر آیندہ اٹھ کھڑے ہونے کے مواقع سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ آج کا پیغام یہی ہے کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

(ترجمان القرآن، اگست ۲۰۰۲ء)